# اقبال کی زندگی کا ایک ورق

شیخ اعجاز احمد

اقبال کے کلام یا ان کے فلسفے کے متعلق میرا کچھ کہنا چھوٹا منھ اور بڑی بات ہوگی۔ آپ سے خطاب کرنے کے لئے میرا انتخاب غالباً اقبال سے اس قرابت کی وجہ سے ہوا ہے جس پر مجھے فخر ہے۔ اس قرابت کی وجہ سے مجھے انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ان کے متعلق بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں۔ جو میرے مشاہدے میں آئیں اور جن سے ان کے کردار کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے آج ایک کا ذکر کروں گا۔ شاید آپ کی دلچسپی کا باعث ہو۔

چچا جان کو ملازمت سے ایک قسم کا تنفر سا تھا۔ ایم اے ہونے کے بعد کچھ عرصے تک وہ پہلے اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ، فلسفہ اور سیاست مدن کے لکچرار اور اسکے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد انھوں نے لاہور میں بیرسٹری شروع کی لیکن اسکے ساتھ ساتھ کچھ عرصہ تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اعزازی پروفیسر بھی رہے۔ کالج کی ملازمت کی وجہ سے وہ صبح کے وقت کچہری نہ جا سکتے تھے گورنمنٹ نے خاص طور پر ہائی کورٹ سے یہ انتظام کرایا تھا کہ ان کے تمام مقدمات دن کے پچھلے حصہ میں پیش ہوا کریں چنانچہ قریباً ڈیڑھ سال تک اس پر عمل در آمد ہوتا رہا اس زمانے میں انڈین ایجوکیشنل سروس میں پنجاب میں غالباً کوئی ہندوستانی نہیں تھا اور یہ سروس زیادہ تر انگریزوں کیلئے مخصوص تھی۔ گورنمنٹ نے انہیں اس سروس کی پیشکش کی۔ لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بیرسٹری کے آزاد پیشے کو پسند کیا۔ چچا جان اوروں کو بھی جہاں تک ہو سکے ملازمت سے گریز کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۱۹ء میں جب میں نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو میری آئندہ تعلیم کا مسئلہ گھر والوں کے سامنے آیا میری خواہش تھی کہ ایم اے میں داخل ہو جاؤں چچا جان کی رائے تھی کہ مجھے لا کالج میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے داخل ہونا چاہئے اس مسئلے کے متعلق کئی خطوط میں نے انہیں اور انھوں نے مجھے لکھے اور آخر مجبور ہو کر میں نے لا کالج میں داخل

ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ستمبر کی چھٹیوں میں جب چچا جان چند دنوں کے لئے سیالکوٹ آئے تو میں نے اس معاملے کو پھر چھیڑا لیکن انھوں نے اپنی رائے تبدیل نہ کی۔ یہ بات مجھے ناگوار ہوئی۔ اور میں نے اس کے اظہار کا یہ طفلانہ طریق اختیار کیا کہ اپنے کمرے میں بند ہوکر بھوک ہڑتال کردی۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک تو گھر میں کسی کو اس بھوک ہڑتال کا شاید علم نہ ہوا۔ لیکن جب دوپہر کے کھانے کے لئے میں کمرے سے نہ نکلا تو والدہ صاحبہ نے کسی کو بلانے کے لئے بھیجا۔ میں نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ جو باوجود کھٹکھٹائے جانے کے نہ کھولا۔ پھر تو ایک تانتا بندھ گیا۔ والدہ صاحبہ اور دیگر رشتے دار مستورات یکے بعد دیگرے دروازہ کھلوانے کی کوشش کرتی رہیں لیکن اندر سے صدائے نہ برخواست والا معاملہ رہا۔ آخر اس بات کی رپورٹ چچا جان کو پہونچی وہ نفسیات کے ماہر تھے انھوں نے مستورات سے کہا کہ میری بھوک ہڑتال کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ اس کے بعد رات ہوگئی مگر کسی نے ہماری خبر تک نہ لی۔ آئیں قل ھواللہ پڑھنے لگیں۔ رات کے کھانے کے وقت جی چاہتا تھا۔ کہ کوئی بھولے سے بھی دروازہ کھٹکھٹائے تو کھول دیں لیکن کوئی دروازے کے قریب تک نہ آیا۔

جب سب لوگ سونے کے لئے چھت پر چلے گئے تو والدہ صاحبہ نے دروازے پر دستک دے کر کہا کہ کھانا دروازے کے باہر پڑا ہے بھوک لگے تو کھا لینا۔ یہ کہکر وہ بھی چھت پر تشریف لے گئیں۔ کچھ وقت کے بعد یہ اطمینان کرکے کہ سب لوگ اوپر جا چکے ہیں۔ میں نے دروازہ کھولا دروازے کے قریب ایک کشتی میں کھانا رکھا تھا۔ میں بھوک سے بے حال ہو رہا تھا۔ خوب سیر ہوکر کھایا اور پھر دروازہ بند کرکے کمرے میں ہی سوگیا۔ گرمیوں کا موسم تھا رات بے آرامی میں کٹی۔ صبح ناشتے کے وقت سے کچھ پہلے چچا جان دروازے پر آئے۔ دروازے کے اوپر والے حصے میں شیشے لگے ہوئے تھے جن میں سے میں نے انہیں دیکھ لیا اور فوراً اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ اس موسم میں گھر پر وہ اکثر دھوتی اور بنیان پہنے رہتے اس وقت بھی یہی لباس تھا لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی کمرے میں داخل ہوئے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم نہ تھا کہ تم گاندھی کے چیلے بن گئے ہو،، میں نے ندامت سے سر جھکا لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں والدہ صاحبہ ان کے لئے ناشتہ لیکر آئیں۔ ہمارے بازار میں ایک حلوائی تھا اس کے ہاں کا حلوہ پوری بہت مشہور تھا۔ چچا جان بھی جب سیالکوٹ تشریف لاتے تو

کبھی کبھی اس سے شوق فرماتے۔ والدہ صاحبہ خاص طور پر ان کے لئے اس کا اہتمام فرماتیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن بھی ان کے لئے ناشتے میں چاء کے ساتھ وہی حلوہ پوری تھا۔ وہ ناشتے کے ساتھ ساتھ مجھ سے باتیں بھی کرتے رہے۔ ایل۔ ایل۔ بی میں داخلے کے خلاف میرا اعتراض صرف یہ تھا کہ وکالت میں کامیابی کے لئے میرے خیال میں تقریر کا ملکہ ضروری ہے۔ اور چونکہ مجھے یہ ملکہ حاصل نہیں۔ لہذا میری طبیعت اس پیشے کی طرف راغب نہیں ہوتی۔ انھوں نے فرمایا کہ بڑی بڑی تقریروں کی ضرورت صرف اعلیٰ درجہ کے قانونی کام کے لئے ہوتی ہے۔ جو فی الحال پنجاب میں ہے ہی نہیں۔ اور وکالت کے کام کے لئے طبعی لگاؤ کی اس قدر ضرورت نہیں جس قدر کہ محنت اور تجربے کی ہے۔ کہنے لگے کہ پریکٹس سے آدمی وکالت کے سب پہلو سیکھ جاتا ہے۔ اور اگر ایل۔ایل۔بی کے بعد تم پریکٹس شروع کروگے تو میں خود تمہیں کام سکھا دونگا۔ آخر میں فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ اگر تم ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کرلو تو آئندہ زندگی میں بہت فائدے اٹھاؤگے۔ اور اگر پریکٹس نہ بھی کرو تو عمدہ ملازمت ملنے میں سہولت ہوگی۔ میں نے پروفیسروں کی زندگی کے علمی ماحول کا ذکر کیا تو فرمایا ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔ اپنی گورنمنٹ کالج کی پروفیسری کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی اپنے کلرک سے کرتا ہے۔ اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی بیزار ہوئی کہ ارادہ کرلیا کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے پرہیز کرونگا۔ اگرچہ میری آئندہ تعلیم کے متعلق وہ اپنی رائے پر پختگی سے قائم تھے لیکن آخری فیصلہ مجھی پر چھوڑا۔ میں نے ہتھیار ڈال دئے اور لا کالج میں داخل ہونے پر رضامند ہوگیا۔ اس گفتگو کے دوران میں وہ ناشتہ ختم کر چکے تھے۔ تولیہ سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کھڑے ہو گئے والدہ صاحبہ سے مخاطب ہوکر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''پوریاں بہت لذیذ تھیں اعجاز کو بھی کھلائیے۔ کل سے فاقہ کر رہا ہے''۔ رات کے کھانے کے خالی برتن کمرے میں ایک طرف رکھے تھے۔ لیکن وہ ان کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر چلے گئے۔ مجھے ایک عرصہ بعد معلوم ہوا کہ رات کا کھانا انہیں کی ہدایت کے بموجب دروازہ پر رکھا گیا تھا۔ اور انہیں علم تھا کہ سب کے چھت پر چلے جانے کے بعد میں نے چپکے سے اٹھ کر کھانا کھا لیا تھا۔

۱۹۲۱ء میں میں نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کرلی۔ پہلے چچاجان کا

خیال تھا کہ میں چکوال ضلع جہلم میں پریکٹس شروع کروں۔ اس ضلع کا کام اکثر ان کے پاس آتا تھا۔ اور وہاں کے مقدمے باز حلقوں میں ان کی کافی شہرت تھی۔ لیکن اپنے بعض احباب سے مشورہ کر کے آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ میں چار پانچ سال اپنے شہر سیالکوٹ میں پریکٹس کروں۔ چنانچہ میں نے وہاں کام شروع کردیا۔ وکالت کا پیشہ ایک صبر آزما پیشہ ہے۔ اور مبتدیوں کو ابتدائے کار میں بہت ہی ہمت شکن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مجھے اس پیشے سے پہلے ہی سے بے رغبتی سی تھی۔ لہذا چند مہینوں کے بعد جب ایک دوست سے یہ معلوم ہوا کہ انکم ٹیکس کے محکمہ میں انکم ٹیکس آفیسر کی چند آسامیاں خالی ہیں۔ تو میں نے درخواست دینے کا ارادہ کر لیا۔ چچا جان کو جب اس بارے میں تحریر کیا تو انہوں نے درخواست دینے کی اجازت دیتے ہوئے لکھا کہ ''وکالت کے پیشے کے متعلق جو تم نے لکھا ہے۔ وہ موجودہ صورت میں درست ہے۔ اور ابتدا میں واقعی بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ مگر آئندہ زمانہ میں اس پیشے کے لئے ترقی کے بہت سے امکانات ہیں بشرطیکہ گورنمنٹ نے مزید اصلاحات منظور کرلیں''۔ ان دنوں محکمہ انکم ٹیکس کے کمشنر مسٹر ڈارلنگ تھے۔ وہ چچاجان سے انگلستان کے زمانے سے واقف تھے اور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میں نے جب چچا جان کو اس کے متعلق لکھا تو انہوں نے جواب دیا کہ ''ملازمت وغیرہ کے معاملے میں انگریزوں سے دوستی پر اعتماد کرنا ٹھیک نہیں مسلمانوں کو آج کل کسی قدر شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب اس شک میں ہمارے ہم وطن بھی انگریزوں کے ساتھ شریک ہو جائینگے''۔ مزید فرمایا کہ'' اس وقت تو بالعموم انہی مسلمانوں کو ملازمت کے لئے پسند کیا جاتا ہے (خاص کر اعلیٰ ملازمتوں کے لئے) جن کی اسلامیت حکومت کے خیال میں کمزور ہو اور اس کمزوری کا نام وسعت خیال یا لبرلزم رکھا جاتا ہے''۔ آخر مجھے انکم ٹیکس آفیسر مقرر کر کے چھ ماہ کی ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔

انکم ٹیکس آفیسر صاحب، جن سے مجھے ٹریننگ لینا تھی، ایک ایسے ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو عیسائی ہوگیا تھا۔ ان کے تعصب کی کافی شہرت تھی۔ کچھ وہ سخت گیر تھے کچھ میں نا تجربہ کار اور رسم چاکری سے ناواقف اس پر طرہ یہ ہوا کہ رہائش کے لئے ویسا انتظام نہ ہو سکا جس کا میں عادی تھا۔ اس جسمانی اور ذہنی کوفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اختلاج کی معمولی سی شکایت ہوگئی۔ چچاجان کو خبر ملی تو وہ متردد ہوئے اور مجھے لکھا کہ ''اپنا مفصل حال لکھو۔ تو تمہارے لئے کوئی نسخہ تجویز کراؤں۔ یہ بھی فرمایا کہ

اس نسم کی شکایت مجھے بھی طالب علمی میں ہو گئی تھی۔ گھبرانا نہیں چاہئے۔ اللہ تعالیٰ شفاء دیگا،،۔

میں نے جواب میں لکھا کہ صحت کے متعلق کوئی فکر کی بات نہیں البتہ انکم ٹیکس آفیسر کا رویہ ہمدردانہ نہیں۔ انہوں نے جواب میں جو خط لکھا اس کا اقتباس یہ ہے :

''تمہارا خط ملا الحمد للہ کہ کوئی خاص شکایت تم کو نہیں۔

مجھے اس کا بڑا تردد ہو رہا تھا۔ کوئی فکر نہ کرنا اگر تم کام کر سکتے ہو تو کرو ورنہ کچھ پروا نہیں۔ آخر تمہارے ہاتھ میں ایک مفید پیشہ ہے۔ جس سے تم باندہ اٹھا سکتے ہو۔ رزق انسان کا عمرو زید کے ہاتھوں میں نہیں۔ خدا کے ہاتھ میں ہے۔

رزق از وے جو بجواز زید و عمرو
مستی از وے جو بجواز بنگ و خمر

تمام معاملات کو اللہ کے سپرد کرنا چاہئے اور ہر قسم کی فکر دل سے نکال دینا چاہئے۔ خدائے تعالیٰ کارساز ہے اور انسان کی فکر اس کے لئے باعث آزار ہے۔ بالفرض اگر تم کو اپنی موجودہ مہم میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر کیا۔ خدائے تعالیٰ رزق کا کوئی اور سامان پیدا کردیگا اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ غرض یہ ہے کہ انسان کو اپنی صحت و حالت کے مطابق اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرنا چاہئے۔ اور نتائج خدا کے سپرد کر دینے چاہئیں،،۔

اس خط سے میرے دل کو بہت اطمینان ہوا میں نے تندہی سے اپنے فرائض منصبی کو پورا کرنے کی کوشش جاری رکھی لیکن انکم ٹیکس آفیسر صاحب کا رویہ بدستور غیر ہمدردانہ رہا۔ میں نے پھر چچا جان کو خط لکھ کر مشورہ طلب کیا تو جواب میں ایک پوسٹ کارڈ پر صرف یہ شعر لکھا ہوا موصول ہوا۔

''از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجہ از برہمن کافر تری،،

میرے لئے یہ شعر اونگھتے کو ٹھوکنے کا بہانہ ہو گیا۔ میں نے اسی دن ملازمت

سے استعفیٰ دے دیا اور سیالکوٹ واپس آگیا۔

ایک اچھی ملازمت کو میرے یوں ترک کر دینے کا ابا جان کو بہت افسوس ہوا۔ انھوں نے چچا جان کو اس کے متعلق لکھا ہوگا کیونکہ میں نے ان کا جواب ابا جان کے نام دیکھا جس میں لکھا تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ انکے مشورے سے دیا گیا ہے وہ بد دل نہ ہوں اللہ تعالیٰ ضرور کوئی بہتر صورت پیدا کردے گا۔

میں نے سیالکوٹ واپس پہنچ جانے کی اطلاع دی تو مجھے بھی خط لکھا جس کا کچھ حصہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس کا اقتباس سنئیے۔

''تمھارا خط ملا۔ امید ہے تمھاری صحت جلد اچھی ہو جائے گی اور جو تکلیف تم کو ملازمت پر جانے آنے میں ہوئی ہے وہ بعد کی کامیابی سے نسیاً منسیا ہو جائے گی۔ تلخ تجربات سے گھبرانا نہ چاہئے۔ زندگی پر ان کا بھی ( Restraining Influence ) ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے ان کی تلخی کا احساس ہوتا ہے اور روح کو ایذا پہونچتی ہے۔ تاہم بعد میں فائدہ معلوم ہوتا ہے اور انسان اس بات کے لئے شکر گذار ہوتا ہے کہ اس کو اس قسم کے تجربات ہوئے۔ جرمنی کے پیغمبری شاعر گوئٹے نے اپنے معاصر جوانوں کے روحانی اضطراب اور بے چینی کا مشاہدہ کرکے ان کو یہ پیغام دیا تھا۔

Art still has truth — take refuge there.

اس وقت اسلامی دنیا کی وہی حالت ہے جو نپولین کے وقت میں جرمنی کی تھی اور میرا پیغام بھی مسلمان نوجوانوں کے نام وہی ہے جو گوئٹے نے دیا صرف اس قدر فرق ہے کہ میں نے (Art) کی جگہ لفظ (Religion) رکھ دیا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔

آرٹ میں اطمینان ضرور ہے مگر قوت نہیں ہے مذہب میں اطمینان اور قوت دونوں چیزیں ہیں۔''

یہ خط ۱۰ جون ۲۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ آج تقریباً ۳۳ سال بعد اگرچہ اسلامی دنیا کی وہ حالت نہیں جو ۲۲ء میں تھی لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمانوں کو اس پیغام پر عمل پیرا ہونے کی اس سے زیادہ ضرورت نہیں جتنی ۲۲ء میں تھی۔

اپنی زندگی میں اقبال نے اس پیغام کو مختلف انداز میں بار بار اپنے کلام میں دھرایا ھے ۔ آج ان کے انتقال کے بائیس سال بعد میں نے اس پیغام کو مسلمان نوجوانوں کے افادے کی خاطر اقبال کی اپنی اسی سیدھی سادی نثر میں دھرایا ھے جس میں انھوں نے یہ پیغام مجھے اس وقت دیا جب میں جوان تھا ۔ اور مصاف زندگی میں شامل ھوتے ھی پہلے قدم پر ایک ناکامی سے دوچار ھوا تھا۔

چچاجان سے متعلق ان نجی واقعات کو آپ کے لئے بار سماعت نہ بناتا لیکن بقول اقبال :

برآور ھر چہ اندر سینہ داری
سرودے، نغمۂ ، آھے، فغانے